امام حسینؑ، حق احتجاج و انقلاب

پروفیسر سید جعفر رضا بلگرامی

انسان کی فطرت شاید باغی واقع ہوئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ حیات سے ممات تک سماج فرد کو اطاعت کا سبق سکھاتا رہتا ہے کہ وہ منضبط رہے اسی وجہ سے وہ سماجی ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی ہدایت کرتا رہتا ہے۔ انفرادیت پسندی کو خود رائی کا نام دیا جاتا ہے۔ سماجی ماحول میں ڈھل جانے کو تہذیبی اقدار کا پیرو سمجھا جاتا ہے۔ اسکول میں یہی درس طالب علموں کو دیا جاتا ہے اور جو اس پر پورے اترتے ہیں انہیں کو ہونہار سمجھا جاتا ہے۔ اگر چہ ہر مذہب کی بنیاد انقلاب ہوتا ہے لیکن جب مذہب کی عملی کارکردگی شروع ہوتی ہے تو اسی اطاعت گزاری کو ذریعہ نجات بتایا جاتا ہے۔ ہمارے مذہبی پیشوا کبھی جنت کی لالچ، کبھی دوزخ کا خوف، کبھی بیماری، غربت، جنگ، تشدد اور قحط کو عذاب الٰہی بتا کر انسان کی باغیانہ فطرت کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سیاسی میدان میں بھی اسی اطاعت کا نعرہ ہر سیاسی پارٹی کے جھنڈے پر آویزاں نظر آتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ برسراقتدار آنے سے پہلے انفرادی آزادی کی بات کی جاتی ہے، لیکن برسراقتدار آنے کے بعد آزادی کا نعرہ ڈسپلن میں بدل جاتا ہے، قواعد وضوابط کی بات کی جانے لگتی ہے اور اس سے انحراف کرنے والوں کو غدار کہا جاتا ہے۔ سائنس کے میدان میں بھی انسان کو مطیع بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ذہنی انتشار کو بغاوت کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے اور اس اعتبار سے اس کو ایک بیماری سمجھ کر اس کا نفسیاتی علاج کیا جاتا ہے۔ دوائیں دی جاتی ہیں تاکہ انسانی ذہن میں انتشار کی جگہ سکون پیدا ہو اور بغاوت کو فروغ نہ مل سکے۔ پھر بھی اگر انسانی ذہن میں باغیانہ انتشار باقی رہتا ہے تو بجلی کا شاک دے کر اس کو پُرسکون بنا دیا جاتا ہے۔

سماج کی ان تمام کوششوں کے باوجود انسان مطیع وفرمانبردارانہ ہو سکا۔ شاید خمیر آدم میں جذبۂ بغاوت کی اہمیت مضمر ہے بے جا نہ ہوگا کہ اگر اس جذبہ کی کرشمہ سازیوں پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ فرد کا یہی جذبۂ بغاوت ہے جو اس کو سرزمین پر اپنا وجود برقرار رکھنے میں مددگار ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو اس کو بے چین، غیر مطمئن اور تحقیق پسند بناتا ہے۔ یہی جذبۂ بغاوت ہے جس کی وجہ

سے انسان اپنے جسم کی قید میں مفید نہ رہ سکا۔ اس نے اپنے حواس خمسہ کو وسعت دے لی۔ آج اس کی انگلیاں فضا کو ٹٹولتی ہیں، اس کی آنکھیں ذرے کے حجم کو بڑھا کر دیکھتی ہیں، اس کے کان سمندر کے تحت الثریٰ کی سرگوشیاں سن لیتے ہیں۔ اسی جذبۂ بغاوت کی وجہ سے انسان اپنے ذہن کی سرحدوں میں مقید نہ رہ سکا۔ اس نے فطرت کی تسخیر کی ، کائنات کی تحقیق کی اور عمل پیدائش کے راز افشا کئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی کی حد بندیوں میں بھی نہ رہ سکا۔ وہ موت سے لڑا، اس نے زندگی کی سرحدوں کو بڑھایا۔

ایک طرف سماج کی تمام تر کوششیں کہ فرد مطیع وفرمانبردار بن جائے۔ دوسری طرف فرد کی جدوجہد کہ اس کی باغیانہ صفت بحال رہے۔ ایک طرف سماج کو اندیشہ کہ اگر فرد کی باغیانہ فطرت بحال رہی تو یہ سماجی امن وامان کے لئے خطرہ کا باعث ہوگی اور نظم وضبط درہم وبرہم ہوجائے گا۔ دوسری طرف فرد کو خدشہ کہ اگر سماجی کوششیں کامیاب ہوجائیں اور اس طرح باغیانہ فطرت پر کنٹرول حاصل ہوگیا تو انفرادی آزادی ختم ہوجائے گی، اور فرد سماج کا ایک حقیر ذرہ بن کر رہ جائے گا۔ اس طرح ازل سے سماج کی اطاعت اور فرد کی بغاوت کے درمیان ایک جنگ جاری ہے۔ لیکن انداز جنگ یہ ہے کہ سماج کی کوششیں منظم ومسلسل ہیں جبکہ فرد کی کوششیں کچھ ایسی رہی ہیں، جیسے کہ کبھی کبھی کوئی شعلہ بھڑک جائے۔

سماج کی مسلسل ومتواتر کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ سماج کا تہذیب یافتہ طبقہ بغاوت کو بڑی حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کا عادی بن چکا ہے۔اس طبقہ کے نزدیک بغاوت ایک اتفاقی حادثہ ہے۔ یہ ایک غیر تربیت یافتہ گروہ کی تخریبی کاروائی ہے۔ اس طبقہ کے نزدیک بغاوت اپنی اصل کے اعتبار سے ناجائز اور اپنی صلاحیت کے اعتبار سے مخرب اخلاق ہے۔لیکن بغاوت کے سلسلے میں یہ غلط فہمی سماج کی پیدا کردہ ہے جس نے کہ بغاوت کا اصل مفہوم ہی مسخ کردیا ہے۔

در اصل کسی مستحکم ومضبوط طاقت پر یہ دباؤ ڈالنا اور یہ باور کرانا بغاوت ہے کہ وہ طاقت اپنے وجود وبقا اور جائز استعمال کے لئے قانون فطرت اور سماجی اقدار کے مطابق رہے۔ کسی طاقت کو قانون فطرت سے ہم آہنگ رہنے پر مجبور کرنا بغاوت ہے اور آج کے انسانی ذہن کا ایک انقلابی وتہذیبی عمل سمجھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ سماجی قانون جائز سمجھے جائیں گے جو قانون فطرت کے مطابق ہوں اور اس کا فیصلہ کرنے کا حق حاکم کو نہیں بلکہ افراد کو حاصل ہے۔ ہر جائز قانون اقتدار

پسند حاکم کی من مانی طبیعت نہیں ہوا کرتا۔ ان کی جڑیں افراد کے ضمیر میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس لئے فرد یہ حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق قوانین کو قانون فطرت کے مطابق پا کر سر تسلیم خم کردے یا ان کو قانون فطرت کے خلاف سمجھ کر بغاوت کردے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی قانون صرف اس وجہ سے جائز نہیں ہوجاتا کہ اس کا مخرج حکمراں ہے بلکہ اس وجہ سے جائز قرار پاتا ہے کہ ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر تسلیم شدہ قانون جائز ہی ہو کیونکہ قانون کی اطاعت جبر و دباؤ سے بھی تو کرائی جاسکتی ہے۔ اس اعتبار سے قانون کے تین مزاج ہوئے۔ ایک قانون ساز کا مزاج جو قوانین وضع کرتا ہے۔ دوسرا حاکم کا مزاج جو آبادی پر قوانین نافذ کرتا ہے اور تیسرا افراد کا اخلاقی مزاج جس کی بنیاد پر وہ قوانین کی اطاعت کو دل سے قبول کرتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ قانون ساز کا وضع کردہ قانون یا حاکم کا عاید کردہ قانون افراد کے اخلاقی مزاج سے ہم آہنگ ہوجائے۔ ہٹلر کے قانون اس وجہ سے قانون تھے کہ اپنے زمانہ میں وہ موثر طور پر آبادی پر عاید کئے گئے تھے۔ لیکن وہ تمام افراد جو آزادانہ طور پر قوانین کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان قوانین کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ طاقت چاہے جتنی وسیع و مستحکم کیوں نہ ہو بجائے خود جائز قانون کا جواز نہیں بن سکتی۔ قانون کی سند قبولیت نہ ہو وہ مخرج ہوسکتا ہے جہاں کہ وہ قانون وضع کئے جاتے ہیں اور نہ ہی وہ سیاسی طاقت ہوسکتی ہے جس کے بل بوتے پر قانون آبادی پر نافذ کئے جاتے ہیں بلکہ صرف اخلاقی اقدار ہیں جن کی بنیاد پر قانون جائز قرار پاسکتا ہے۔ ہم قانون کو اپنے ضمیر کی حمایت فراہم کرکے اسکو ''Legal''(قانونی) یعنی جائز و شرعی بناتے ہیں۔ اور یہیں سے فرد کے حق بغاوت کا جواز پیدا ہوتا ہے۔

یوں تو حکمرانوں سے بڑی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور بڑے تکلیف دہ قانون بنتے ہیں جن کو لوگ بغیر کسی بغاوت کے برداشت کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی فرد واحد یا گروہ پر یہ انکشاف ہوجائے کہ خرابیوں ، ابہام اور چالبازیوں کا ایک سلسلہ لاامتناہی ہے جو کہ عمداً اختیار کیا گیا ہے جس سے حکمراں کی بدنیتی کا صاف پتہ چلتا ہے تو وہ فرد یا گروہ خاموش نہیں رہ سکتا کیونکہ انسان کی تہذیبی اقدار کی بقا کے لئے بغاوت کرنا لازمی ہے۔ جن مذہبی اقدار نے انسان کو ایک تہذیبی رشتہ میں منسلک کیا ہے۔ اگر کسی حکمراں کا طرز حکمرانی ان اقدار ہی کو ختم کررہا ہو تو ایسے حکمراں کے خلاف

اعلان بغاوت غداری نہیں، عین تہذیبی حق ہے۔

بغاوت پر کئی طرح سے اعتراض کئے جاتے ہیں، پہلا اعتراض یہ ہے کہ بغاوت امن و امان اور استحکام کو درہم برہم کردیتی ہے اس لئے جو بھی اس کا مرتکب ہوگا، وہ غدار ہوگا۔اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی حکمراں قانون فطرت کو مسخ کررہا ہو، سماجی تہذیب کے اقدار کو لوٹ رہا ہو تو کیا ایسے حکمراں کے خلاف بھی اعلان احتجاج بغاوت غداری سمجھی جائے گی؟ اگر یہ غداری ہے تو کسی رہزن و ڈاکو کو کیوں چیلنج کیا جائے کیونکہ اس سے بھی امن وامان کو خطرہ لاحق ہوگا اور بلاوجہ کی خونریزی ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ غداری کے الزام سے بچنے کے لئے اور محض امن وامان ، وہ چاہے جیسا بھی ہو، باقی رکھنے کی خاطر ، اگر ہم خاموشی اختیار کرلیں اور اس طرح اپنے حق احتجاج و بغاوت سے دستبردار ہوجائیں تو پھر ایسے استحکام اور امن وامان کا مقصد ہی کیا رہ جائے گا۔ یہ امن تو ہوگا مگر در اصل تشدد پسندوں اور جارحانہ عمل کے مرتکب لوگوں کے حق میں۔ بغاوت کے سلسلے میں دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر فرد کا حق بغاوت تسلیم کرلیا جائے ،تو وہ بغاوت کے نام پر اپنے ہر تشدد کو جائز قرار دے لیگا۔ اور اس طرح گویا اس کو سماج کے امن وامان کے برباد کرنے کا حق حاصل ہوجائے گا۔لیکن فرد کے حق بغاوت کو اس بنیاد پر برا سمجھنے والے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ بغاوت بری سہی لیکن اتنی بری نہیں جتنی کہ وہ حالات جو بغاوت کے بیج بوتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی اہم ہے کہ جب تک کوئی فرد انتہائی شدت کے ساتھ اپنے مقصد بغاوت کی حقانیت کو محسوس نہ کرے، وہ خون بہانے اور قربانی پیش کرنے پر رضا مند نہیں ہوسکتا، اس لئے یہ ہر شخص کا کام نہیں ہے کہ وہ بغاوت کی آڑ لے کر تشدد کو جائز قرار دے لے۔ اس کے علاوہ انقلاب کے لئے بغاوت کبھی بے ساختہ اور اچانک نہیں ہوتی۔ عام طور پر ہر انقلاب سے پہلے عوام ایک عرصہ تک فلاح واصلاح کا صبر سے انتظار کرتے ہیں۔ بغاوت اس وقت شروع ہوتی ہے جبکہ صورت حال یہ واضح کردیتی ہے کہ اب حکمراں کی اصل حقیقت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ بغاوت کے لئے اکثریت کا حامی ہونا ضروری ہے،اسی بنیاد پر اقلیت یا فرد واحد کی بغاوت کو غداری کہا جاتا ہے۔لیکن عوام نہ تو نظام کی خامیوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کے تحت جو عادت مستحکم ہوچکی ہے اس کو چھوڑ کر بغاوت کے حامی بن سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی نظام میں وقت کے ہاتھوں یا کسی بدچلنی یا بداطواری کی وجہ سے کوئی خلقی

خرابی پیدا ہوگئی ہے تو اس کی صحت اتنی آسان نہیں ہے چاہے ساری دنیا دیکھتی اور سمجھتی رہے کہ اصلاح کا یہی موقع ہے۔ عوام کو اس اصلاح کے احساس اور اس کے مطابق اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرنے میں ہمیشہ دقت ہوتی ہے اس لئے بغاوت کا عمل کبھی بھی اکثریت کا حامل نہیں ہوتا۔ احتجاج و بغاوت ہمیشہ چند شخصیتیں ہی کرتی ہیں اور وہ بھی اس مفروضہ پر کہ ان کی قربانی آئندہ نسلوں کے ضمیر کو بیدار کرتی رہے گی اور اس کی حقانیت پر ان کو قائل کرتی رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر باغی کی شکست وقتی ہوتی ہے لیکن نسل و زمانہ کے اعتبار سے اس کی فرح ابدی ہوجاتی ہے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ حکومت کی طاقت بے پناہ مضبوط و مستحکم ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں فرد واحد کی طاقت حقیر ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے بھی اگر کوئی فرد حکومت سے ٹکر لیتا ہے تو گویا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔ اس کے دو جواب ہیں:

پہلا یہ کہ اگر ہر فرد اپنی طاقت کو حکومت کے مقابلے میں حقیر سمجھ کر خاموشی اختیار کرے تو پھر انصاف طاقتور کی مرضی بن جائے گا۔ لیکن یہ وہ نظریہ ہے جس کے خلاف پوری عالم انسانیت ہمیشہ احتجاج کرتی رہی ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ فرد واحد کی طاقت کو اس وقت حقیر سمجھا جائے گا جبکہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی حمایت دوسروں میں پیدا نہ کرسکے اور یہ حمایت پیدا نہ کرسکنے میں کوئی زمانہ کی قید نہیں ہے۔ باغی یہ جانتا ہے کہ چاہے وقتی طور پر یہ حمایت پیدا نہ ہوسکے لیکن حالات و زمانہ کی کروٹ لوگوں کو اس کا نظریہ تسلیم کرنے پر مجبور کردے گی۔ حسینؑ اپنے زمانہ میں چاہے ۷۲ افراد ہی کو اپنا ہمنوا بنا سکے ہوں لیکن آج ہر قوم وملت مقصد حسینی کی حقانیت کی گواہ بن چکی ہے۔ زمانہ سے ماورا ہوکر حسینؑ کی طاقت کا جائزہ لیجئے تو یزید ہی کی حکومت حقیر نظر آئے گی۔ اس لیے یہ کہنا بے بنیاد ہے کہ فرد واحد کی طاقت حقیر ہوتی ہے۔

بغاوت کی اس وضاحت میں اگر حسینؑ کے عمل کا جائزہ لیا جائے اور ان کے اردگرد کی سیاسی فضا کا تجزیہ کیا جائے تو اس نتیجہ پر پہونچا جاسکتا ہے کہ یزیدی راہ وروش کے خلاف حسینؑ کا احتجاج واعلان بغاوت اور اس کے نتیجے میں رونما ہونے والا عظیم انقلاب، حق بجانب تھا۔ حسینؑ ایک مضبوط و مستحکم طاقت کو قانون فطرت کے مطابق لانا چاہتے تھے۔ حسینؑ جب فرعون صفت یزید کو اقدار اسلامی سے خارج کر رہے تھے اور اس کے خلافت اپنی بغاوت کو قانون فطرت کا حامی قرار دے رہے تھے تو وہ قانون وبغاوت کے الفاظ کو نئے معنی پہنا رہے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ سماج

کے مروجہ قوانین کی اطاعت اس وقت بلند ترین تمدنی خصوصیت سمجھی جائے گی جب وہ قانون فطرت کے مطابق ہوں۔ یزید قانون فطرت کو مسخ کر رہا تھا، اقدار اسلامی کو پامال کر رہا تھا پس اس کے خلاف حسینؑ کے اعلان احتجاج و بغاوت کو غداری نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ عین تہذیبی حق تھا اسی طرح حسینؑ کی بغاوت اور ان کا انقلاب بے ساختہ نہیں تھا۔ انہوں نے امام حسنؑ کے زمانہ سے اپنے زمانہ تک حالات کا صبر سے انتظار کیا۔ اعلان بغاوت تو اس وقت ہوا جبکہ خود یزید، اپنی احساس کمتری کے نتیجہ میں، حسینؑ سے بیعت کا طلبگار ہوا۔ حسینؑ کی بغاوت ایسے وقت میں برپا ہوئی تھی جبکہ اسلامی نظام میں حکمراں کی بدچلنی و بداطواری کی وجہ سے، اخلاقی خرابی پیدا ہوچکی تھی حسینؑ کا نظریہ اپنے زمانہ میں اگرچہ ایک اقلیت کا نظریہ تھا لیکن زمانہ کی مجموعی حمایت کے مقابلہ میں مزید استحکام آج ایک حقیر تنکا نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حسینؑ کی طاقت جو بظاہر بے اثر معلوم ہوتی تھی اس قدر جلد مؤثر ثابت ہوئی کہ یزید کو اپنے ہی دور حکومت میں اپنا تخت و تاج متزلزل ہوتا دکھائی دیا۔

ہر صحت مند اور برحق احتجاج و بغاوت ایک کامیاب انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہے جو اس عنوان کا دوسرا جزو ہے۔ بغیر انقلاب کے بغاوت یقینا غداری ہے۔ بغیر احتجاج و بغاوت کے انقلاب یقینا محض جنون ہے۔ انقلاب بغاوت کی حقانیت کا ضامن بنتا ہے اور بغاوت انقلاب کی امانتدار بنتی ہے، بغاوت ایک ذریعہ ہے، انقلاب کی کئی منزلیں ہوتی ہیں، ایک باعمل انقلاب ہوتا ہے۔ ایک خاموش و بے مزاحمت انقلاب ہوتا ہے، ایک نفسیاتی انقلاب ہوتا ہے اور ایک جوابی انقلاب ہوتا ہے۔ جو انقلاب اپنی ان چاروں منزلوں کو پار کرلیتا ہے وہی مکمل انقلاب کہلاتا ہے۔ ورنہ اکثر انقلاب، اپنی منزلیں پوری نہ کرسکنے کے باعث نامکمل وادھورے رہ جاتے ہیں۔ حسینؑ کے انقلاب نے اپنی تھوڑی ہی مدت میں جس سرعت کے ساتھ انقلاب کی چاروں منزلوں کو مکمل کیا اس کی مثال دنیا میں کم نظر آتی ہے۔

حسینؑ کے انقلاب کا پہلا درجہ باعمل انقلاب کا ہے۔ انقلاب کی یہ منزل فجر سے عصر تک کی ہے۔ یہ قربانیوں کا انقلاب ہے۔ یہ کشت وخون کا انقلاب ہے۔ یہ انقلاب کی وہ منزل ہے جہاں حسینؑ اپنے اصحاب واقربا کو سپرد خاک کررہے ہیں۔ ایک انقلابی کے سامنے مقصد اہم ہوتا ہے، زندگی کی کوئی قیمت باقی نہیں رہتی اگر حسینؑ بشری تقاضوں کو سامنے رکھتے تو یقینا مقصد حسینی کمزور پڑجاتا۔ حسینؑ کو اپنے مقصد کی اہمیت کا کچھ ایسی ہی شدت سے احساس تھا کہ انہوں نے علی اکبرؑ کو

میدان جنگ میں بلاتامل بھیج دیا، سینے سے تیر کھینچ لیا، خود بیٹے کی لاش اٹھالی۔ بھائی، بھتیجوں اور بھانجوں کو قربان کردیا، جیسے کہ یہ متاع مقصد کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ حسینؑ کے اس استحکام میں مقصد کی عظمت مضمر ہے۔ یہ قربانیوں کا وہ باعمل انقلاب تھا جس کی عظمت مضمر ہے۔

یہ قربانیوں کا وہ باعمل انقلاب تھا جس کو عونؑ و محمدؑ کی جرأت، عباسؑ کی شجاعت، اکبرؑ کی جوانی، قاسمؑ کی کمسنی، حبیبؑ کی پیری، عوسجہؑ وزہیر ابن قین کی للکار، ششماہے کہ معصومیت اور خود حسینؑ کی سالمیت نصیب ہوئی تھی۔ فجر سے عصر تک جتنی قربانیاں حسینؑ نے پیش کی تھیں وہ سب کی سب شخصیت میں مضمر تھیں۔ صرف علی اصغرؑ کی شہادت وہ واحد قربانی تھی جو آفاقی تھی کیونکہ ابھی شخصیت میں اسیر نہیں ہوئی تھی۔ اسی قربانی نے ہر ارض وہر شخص نے قربانی کو معصوم بنادیا تھا۔ یہ تھیں حسینؑ کی عظیم ترین قربانیاں جن کو حسینؑ نے اپنے عظیم اور باعمل انقلاب کی راہ میں پیش کیا۔

اس منزل کا اختتام بھی عجیب انداز سے ہوتا ہے۔ دن ڈھل چکا ہے، لاشے تو میدان میں پڑے رہ گئے لیکن سرتن سے جدا کرکے نوک نیزہ پر بلند کردئے گئے۔ ایک طرف تھا خاندان رسالت کا لٹا ہوا قافلہ، دوسری طرف نیزوں پر بلند سروں کا کارواں۔ سروں کا یہ کارواں رات کی بڑھتی ہوئی سیاہی میں گامزن ہے۔ رعونیت حکومت مطمئن کہ باغیوں کا سر کچل دیا، سروں کو تنوں سے جدا کردیا۔ تشہیر کردی تاکہ لوگوں کو عبرت ہو کہ باغیوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آج سے چودہ سو برس پہلے عوام نے حکومت کے اس طرز عمل سے کہاں تک عبرت حاصل کی۔ لیکن آج یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ رات کی بڑھتی ہوئی سیاہی میں نوک نیزہ پر بلند ان سروں کے قافلے کا تصور جس حساس دل میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ:

''ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے''

یوں حسینؑ کے انقلاب کی پہلی منزل تمام ہوئی اور بلافصل دوسری منزل کا آغاز ہوا۔ یہ بے مزاحمت کی منزل ہے۔ اس منزل میں ظلم کا جواب خاموشی سے دیا جاتا ہے تاکہ ظلم کی شدت کا احساس گہرا ہوجائے اور اسی اعتبار سے معصومیت و بے گناہی نکھر جائے۔ جس طرح انقلاب کی پہلی منزل میدان کربلا اور مرکزی کردار حسینؑ تھے اسی طرح انقلاب کی دوسری منزل شام کا بازار اور مرکزی کردار سید سجادؑ تھے۔ ایک طرف شام کا بازار سجا ہوا دوسری طرف سید سجادؑ طوق وزنجیر میں

گرفتار خاموشی کے ساتھ تماشائیوں کے ہجوم کے درمیان سے گزر رہے ہیں۔ اس وقت سید سجادؑ کی شخصیت دو عوامل پر مشتمل ہے۔ ایک خاموشی ، دوسرے زنجیر کی جھنکار۔ پہلے خاموشی کو لے لیجئے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ جب انسان پر مصائب حد سے زیادہ گزر جاتے ہیں تو وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ لیکن نفسیات کے ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ جب انسان خاموش ہوجاتا ہے تو مجسم زبان بن جاتا ہے۔ امام سید سجادؑ علاّمہ اقبال کے اس مصرعہ کے مصداق تھے:

''خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری''

لیکن حکومت وقت کی اس کم مائیگی کو کیا کہئے جو سید سجادؑ کی خاموشی کو شکست خوردگی کی علامت سمجھ رہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ شکست خوردگی میر کارواں میں پیدا ہوچکی تھی تو اس کا تاثر واضمحلال پورے کارواں میں پایا جانا چاہئے تھا۔ لیکن مجھے تو منظر کچھ دوسرا ہی نظر آرہا ہے۔ علیؑ کی بیٹی اپنے باپ کے لب ولہجے میں مجمع کو بے باکانہ مخاطب کررہی ہے، اپنا تعارف کرارہی ہے، اپنی داستان غم سنارہی ہے جس کو سن کر عوام کی ذہنیتیں پلٹ رہی ہیں، لوگ بے چین ہورہے ہیں۔ سینوں میں آگ بھڑکنا شروع ہوگئی ہے۔ میں اس وقت کی حکومت سے غائبانہ طور پر مخاطب ہوکر کہنا چاہتا ہوں کہ سید سجادؑ کی خاموشی کو شکست خوردگی سمجھنے والو، عوام کی بیچینی کو بھی تو دیکھ لو:

''دلوں کی آگ زباں پا گئی تو کیا ہوگا''

سید سجادؑ کی شخصیت کا دوسرا جز زنجیر کی جھنکار ہے۔ حکومت وقت ایک بار پھر ٹھوکر کھاتی ہے۔ وہ زنجیر وطوق کو ایک قیدی کی علامت سمجھ رہی ہے اور اس سے بے خبر ہے کہ زمانہ کے نشیب وفراز سے جب انسانی شعور نکھرے گا تو پھر اس کے نزدیک یہ زنجیر وطوق قیدی کی نہیں بلکہ ''انقلاب'' کی علامت بن جائیں گے۔ سید سجادؑ کی شخصیت کے ان دونوں اجزاء کو اب ملاد یجئے۔ سید سجادؑ خاموش ہیں۔ صرف زنجیر کی جھنکار سنائی دے رہی ہے۔ حکومت وقت آسودہ کہ اس نے خانوادۂ رسولؐ کے ہرفرد کو خاموش کردیا، طوق وزنجیر میں اسیر کردیا، قیدی بنالیا۔ لیکن حکومت کی کم نگاہی یہ محسوس کرنے سے قاصر ہے کہ زنجیر کی جھنکار چودہ سو برس تک انسانی ذہن کو جھنجوڑتی رہے گی اور جب انسانی ذہن اپنی ارتقا کی منزل میں پہونچے گا تو وہ سید سجادؑ کے خاموش مقصد کا زنجیر کی جھنکار کے لہجہ میں اس طرح اظہار کرے گا:

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

یوں انقلاب کی دوسری منزل تمام ہوئی۔ اب نفسیاتی انقلاب کی منزل ہے ۔ یہ منزل خود یزید کا دربار ہے اور اس کا مرکزی کردار جناب زینب(س) ہیں۔ خاندان رسالت کی عزت مآب خواتین دربار یزید میں بصورت قیدی کھڑی ہیں۔ یہ بجائے خود ایک بہت بڑی رسوائی ہے نہ کہ اس پر یزید کا تمسخر وطنز۔ در اصل یزید سے اس کے علاوہ اور کوئی امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ کل جب وہ حسینؑ سے بیعت کا طلب گار ہوا تھا تو یہ میرے نزدیک اس کی احساس کمتری تھی اور آج ان خواتین کے ساتھ جو یہ ہتک آمیز رویہ اختیار کررہا ہے تو یہ میرے نزدیک اس کی کم ظرفی ہے۔ یزید، ان افراد سے نسبی حیثیت سے تو واقف تھا لیکن ان افراد کے بلندیٔ کردار سے واقف ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ یزید، خلیفۂ وقت تھا، ممکن ہے کہ اس نے سن لیا ہو کہ جناب ہاجرہ اس تصور سے عمر بھر روتی رہیں کہ ''اگر میرا بیٹا اسماعیل ذبح ہوجاتا'' لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی یہ ام لیلیٰ(س)، کربلا کی وہ ہاجرہ تھیں جن کے سامنے واقعتا ان کا بیٹا ذبح کردیا گیا۔ یزید نہیں جانتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی یہ یہ ام رباب(س) وہ ہیں جنہوں نے علی اصغرؑ کی معصومیت کے پیمانہ سے انسان کی درندگی ناپی تھی۔ یزید نہیں جانتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی جناب زینب(س) صبر کا کتنا بڑا کوہ گراں ہیں۔ بن بھائی بن اولاد، بن اعزاء واقرباء، غریب الوطنی، بدنصیبی، بے ردائی، اسیری اور اب دربار یزید میں بے حرمتی نہ معلوم کتنے غبار اس آئینہ کو دھند لانے کی ناکام کوشش کرتے رہے لیکن اس کی جلا ماند نہ پڑی۔ان کے پایۂ ثبات میں لغزش نہ ہوئی۔ لیکن جناب زینب(س) کو جس ہتک آمیز رویہ کا سامنا تھا، اگر کہیں جناب عباسؑ یہاں تک پہونچ گئے ہوتے تو یزید کی دھجیاں اڑگئی ہوتیں۔ مناسب مقام پر اس کی تشریح کروں گا یہ بتانے کے لئے کہ میری یہ بات جذبات پر نہیں، حقیقت پر مبنی ہے۔

دربار یزید، رسولؐ کے پیش کردہ اسلام کی برعکس تصویر۔ یہ ناممکن ہے کہ اس کو دیکھ کر جناب زینب(س) کو اپنے نانارسولؐ نہ یاد آگئے ہوں۔ یہ میرا عقلی اندازہ (Reasanable conjecture) نہیں ہے میرے پاس اس کی ایک نفسیاتی توجیہ ہے وقت اذان مؤذن کو اذان دینے کا حکم ہوا، اللہ اکبر کی آواز بلند ہوئی، جناب زینب خاموش ہیں، اَشْھَدُ اَنْ لآاِلٰـہَ اِلاّاللہ کی منزل آئی ، جناب زینب خاموش

ہیں۔ لیکن جیسے ہی مؤذن نے اشھد انّ مُحمّدًا رّسولُ اللہ کہا جناب زینب تڑپ کے آگے بڑھیں اور یزید سے پوچھتی ہیں کہ اے یزید! بتا محمدؐ میرے کون تھے۔ یاد رکھیئے کہ جب انسان کے ذہن میں کسی شخص کا تصور پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے تو اس کا ذکر ہونے پر اس کا نام بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔ اَشْھَدُ انّ مُحَمّدًا رّسُوْلُ اللہ کا فقرہ سنتے ہی جناب زینب(س) کا یزید سے بے ساختہ سوال کرنا کہ بتا محمدؐ میرے جد کا نام ہے یا تیرے جد کا۔ اگر تو کہتا ہے کہ وہ تیرے جد تھے تو تو جھوٹ بولتا ہے۔ محمدؐ تو میرے جد کا نام ہے اور تو نے انہیں کے نواسہ حسینؑ کا سر کاٹا ہے۔ اس موقع پر حضرت زینب(س) کی زبان سے ان کلمات کا نکلنا یہ بتاتا ہے کہ جناب زینب(س) کے ذہن میں رسولؐ پہلے ہی سے موجود تھے۔ یہ سوال یزید کے لئے اتنا بڑا تازیانہ تھا کہ اس کے بے باکانہ اور توہین آمیز رویہ پر اوس پڑگئی، سرندامت سے جھک گیا، اب تخت سلطنت پر بیٹھا ہوا فرمانروا بچین، اور یہ قیدی مطمئن چشم زدن میں پورا دربار یزید واقف ہوگیا کہ یہ قیدی کون ہیں۔ ان کی چہ می گوئیوں نے یزید کو برہنہ کردیا، یہ تھا نفسیاتی انقلاب۔

ابھی تھوڑی دیر قبل جناب عباسؑ کے سلسلے میں جو میں نے جملہ کہا تھا، یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی تشریح مناسب ہے، اس وضاحت کے لئے کہ میرا یہ جملہ محض جذباتی نہیں تھا۔ دربار یزید میں غیر ملکی سفیر بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ یاد رکھیئے سفرا جس ملک میں تعینات ہوتے ہیں، وہاں وہ اپنے ملک کے لئے فائدہ حاصل کرنے کا مقصد سامنے رکھتے ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر ان کو جو ڈپلومیسی کا پہلا سبق سکھایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جس ملک میں وہ تعینات ہوئے ہیں، اس ملک کی حکومت کو ہاتھ میں لئے رہیں، بگاڑ پیدا نہ کریں، اختلاف نہ کریں، اپنے ملک کے خلاف کسی طرز عمل کو نظر انداز کرجائیں، غصہ پی جائیں، مختصر یہ کہ ڈپلومیسی کا پہلا سبق ضبط نفس ہے۔ اس پس منظر میں ذرا غور کیجئے کہ جیسے ہی جناب زینب(س) نے سوال کیا کہ بتاؤ محمدؐ میرے کون تھے اور اس طرح بھرے دربار میں ان قیدیوں کے خاندانی رشتہ کا انکشاف ہوا تو ایک سفیر نے اپنی ڈپلومیسی کے اس بنیادی سبق کو بالائے طاق رکھ کر یزید سے کہا کہ ''اگر میرے ملک میں بانی مذہب کے خاندان کے افراد کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تو حکومت وقت کی دھجیاں اڑادی جاتیں۔'' ذرا غور کیجئے کہ جب ایک غیر ملکی سفیر، ڈپلومیسی کے بنیادی اصول ضبط نفس کو نظر انداز کرکے یہ کہہ سکتا ہے تو اگر جناب عباسؑ دربار یزید میں ہوتے تو کیا واقعتا ایسا نہ ہوگیا ہوتا۔ سفیر کا یہ ردّعمل اس نفسیاتی انقلاب کا ایک

گرانقدر ستون ہے۔ یہ نفسیاتی انقلاب اپنی انتہا کو اس وقت پہونچا جب ایک ظالم کے گھر میں مظلوم کا ماتم برپا ہوا۔

یہ انقلاب کی تیسری منزل کا اختتام تھا اور یہیں سے چوتھی منزل کا آغاز ہوا۔ جس کو جوابی انقلاب کا نام دیا گیا ہے۔ انقلاب دشمن عناصر کو فنا کرنے کے لئے جوابی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے تا کہ دشمن عناصر انقلاب کے نتیجوں کو نقصان نہ پہونچاسکیں۔ اس انقلاب کا سہرا مختار کے سر ہے، مختار نے ان عناصر کو ختم کر کے انقلاب کے نتیجوں کو مستحکم کر دیا، خود انقلاب کو متحرک کر دیا۔ اس کو رفتار زمانہ بخش دی تا کہ اس انقلاب کا دل ہر زمانہ میں ڈھڑکتا رہے تا کہ لوگ غداری اور حق بغاوت میں فرق سمجھ لیں اور ان دونوں لفظوں کو کسی ایک شخص سے وابستہ کر کے گمراہ نہ کرسکیں۔ اس انقلاب کے تکمیل کا یہ آخری فریضہ تھا جس کو مختار نے پورا کیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حسینؑ کے انقلاب کی یہ چاروں منزلیں انتہائی سرعت کے ساتھ مکمل ہوگئیں حسینؑ کا انقلاب ایک تہہ دار انقلاب تھا، انقلاب در انقلاب تھا۔ ایسے انقلاب کے لئے کتنے ثبات قدم اور کتنے بڑے عزم کی ضرورت تھی۔ آج چودہ سو برس گزر جانے کے بعد جب انسانی ذہن اس انقلاب در انقلاب کی بازگشت کے مجموعی تاثر کو سمجھتا ہے تو بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

حسینؑ کوہ ثبات و قرار زندہ باد
حسینؑ صبر و رضا کا وقار زندہ باد
ہر انقلاب ترا عزم چوم کر اٹھا
حسینؑ عزم کے پروردگار زندہ باد

]⊣[